تزکیۂ نفس کا پہلا سبق

# اپنی اصلاح آپ

نعیم صدیقی

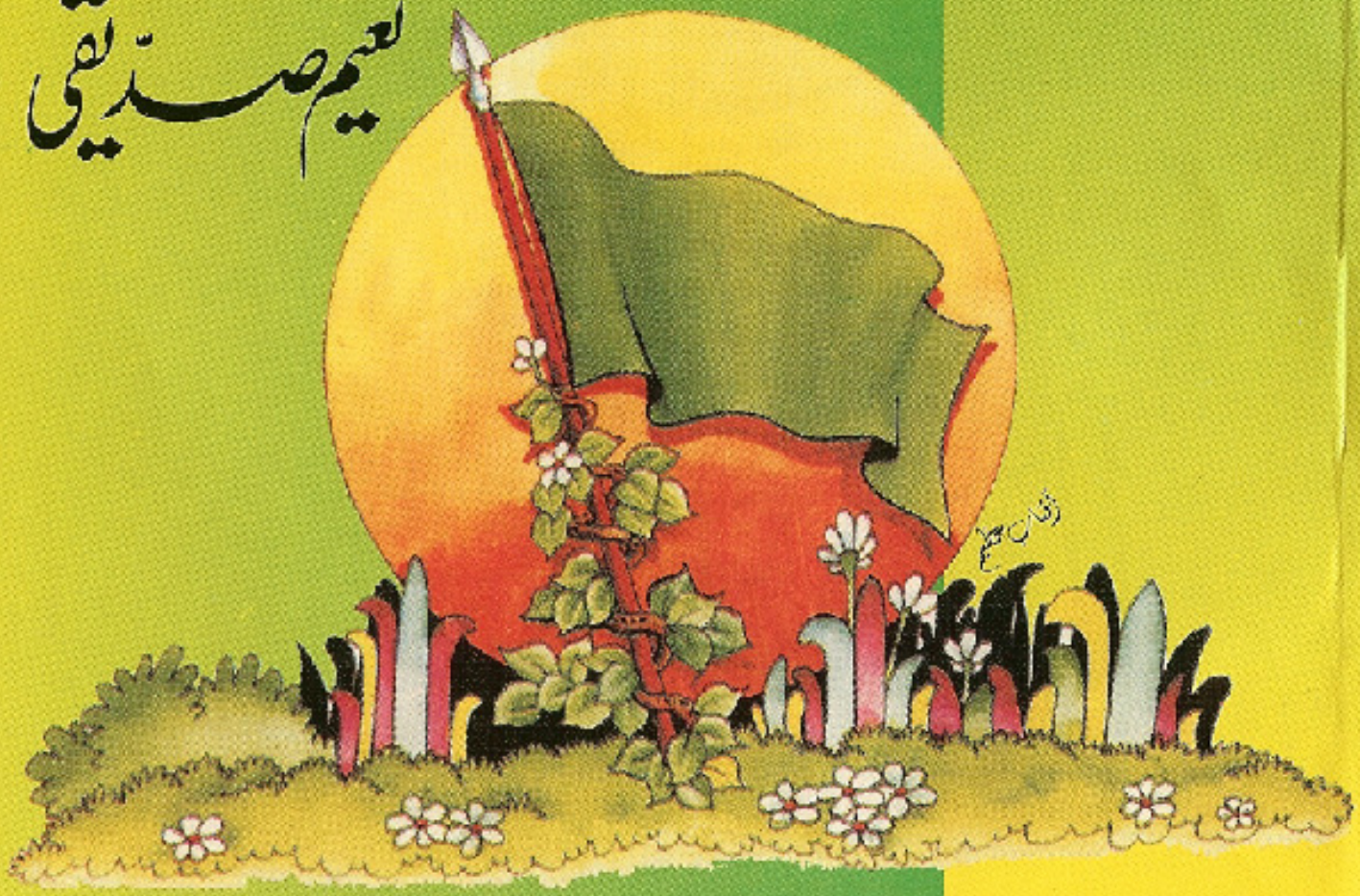

# اپنی اصلاح آپ

## تزکیۂ نفس کا پہلا سبق

نعیم صدیقی

الفیصل
ناشران و تاجرانِ کتب
اُردو بازار لاہور

قیمت: 18.00 روپے

# فہرست عنوانات


| | |
|---|---|
| تمہید | ۳ |
| اپنی اصلاح آپ | ۶ |
| خارج سے مدد | ۸ |
| اصلاحِ نفس کا نقطۂ آغاز | ۱۰ |
| اپنے مرتبہ و مقام کا صحیح شعور | ۱۷ |
| نصب العین | ۱۹ |
| ضابطہ و معیار کا علم | ۲۲ |
| ایک عزم یا ایک فیصلہ | ۲۵ |
| معرفتِ نفس | ۲۹ |

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

# تمہید

انسانی کردار کی تعمیر دنیا کا نازک ترین اور انتہائی مشکل کام ہے ـــــ لیکن ناگزیر اور اہم ترین بھی !! انسانیت جب تک اخلاق کے اعلیٰ اصول و اقدار پر قائم نہ ہو جائے تمدن کو اچھے خطوط پر نشو و نما دینا ممکن نہیں ہے۔ آج جس عالم گیر دورِ فساد سے ہم دوچار ہیں اور جس کے سکوں سوز فتنے ہمارے گھروں کی محدود فضا سے لے کر یو، این، او کے عظیم الشان ادارے تک، ہر جگہ شرر بار ہیں، اس سے نجات کی کوئی راہ اس کے علاوہ نہیں ہے کہ انسان کی سیرت ـــــ فکر و اعتقاد سے لے کر اس کی سیاسی اور معاشی سرگرمیوں تک ـــــ میں انقلابی تبدیلی رونما ہو، ابنائے آدم مادہ پرستانہ کردار سے نجات پاکر خدا پرستانہ کردار کو اختیار کریں۔ احساس رکھنے والے لوگ ایک ایک کرکے اس تاریک ماحول میں ستاروں کی طرح اُبھریں۔

بہ حیثیت ایک قوم ہم خود ایک اخلاقی انقلاب کے شدید محتاج ہیں۔ ہمارے معاشرہ میں بے شمار اخلاقی روگ بہت وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے ہیں۔

ہمارے ہاں انفرادی اور خاندانی، مجلسی اور سماجی، دفتری اور کاروباری نیز سیاسی اور ملکی شعبہ ہائے حیات سبھی کے رگ و پے میں اخلاقی بگاڑ کا زہر سرایت کیے ہوئے ہے۔ اس زہر کے اثرات خوب اچھی طرح نمایاں ہیں۔ افراد اچھے اصول، اچھی روایات اور اچھی قدروں سے خالی ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ اخلاقی پستی ہر قسم کی ترقی میں رکاوٹ بن رہی ہے اور اس کی وجہ سے ہماری قوتیں ضائع ہوتی رہتی ہیں۔ نیا دورِ حیات شروع کرنے کے لیے ہمارا قدمِ اوّل یہی ہو سکتا ہے کہ ہمارے اندر ایک اخلاقی انقلاب نمودار ہو۔

انسانوں میں اخلاقی انقلاب محض خارجی تدبیروں سے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ مجرّد قوانین اور ضابطے، بورڈ اور کمیشن، دفتر اور ادارے، تہدید و تخویف کی تدبیریں، عدالتیں اور جیل، جرمانے اور تازیانے آدمی کو اچھا آدمی نہیں بنا سکتے۔ اخلاقی انقلاب ہمیشہ آدمی کے اندر شروع ہوتا ہے۔ جب تک کوئی نظریہ اس کے سینے میں جاگزیں نہ ہو، کوئی مقصد اس کے اندر سے تحریک نہ دلائے، جب تک خود اسے یہ احساس نہ ہو جائے کہ موجودہ حالت ایک غلط حالت ہے اور جب تک وہ اس غلط حالت سے نکل کر اچھی حالت تک پہنچنے کے لیے رضاکارانہ جذبے سے کام نہ لینے لگے، کوئی بڑی اخلاقی تبدیلی نہیں آ سکتی۔ فردِ انسانی کے نہاں خانۂ روح میں جب تک اپنی ہی شمع روشن نہیں ہو جاتی، باہر کے آفتاب و ماہتاب اس کو ظلمتوں سے نجات نہیں دلا سکتے۔

اسلام اپنے جامع تمدّنی انقلاب کا آغاز اسی طرز کے اخلاقی انقلاب سے کرتا ہے۔ وہ انسانی کردار میں بنیادی تبدیلی پیدا کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس

غرض کے لیے وہ فرد فرد کے اندر کی قوتوں کو جگاتا ہے۔ وہ فرد کو ایمان جیسی طاقت سے مالا مال کرتا ہے، وہ تقویٰ یا خوفِ خدا جیسا پاسبان اس کے اندر بٹھاتا ہے، وہ ضمیر جیسا گائیڈ اور مشیر اس کے ساتھ لگاتا ہے، وہ الہامی علم کی مشعل اس کے ہاتھ میں تھماتا ہے جو صحیح اور غلط کا فرق واضح کرتی ہے۔ وہ اس کے اندر ایک ہمہ وقتی عزم کو بیدار کرتا ہے جو اسے خیر و فلاح کی راہ پر قدم بہ قدم آگے بڑھاتا رہتا ہے۔ آج ہمیں اور ہماری پوری دنیا کو اسلام کے مطلوبہ اخلاقی انقلاب کی ضرورت ہے۔ اور اسی احساس کے تحت یہ پمفلٹ مرتّب کیا گیا تھا۔

یہ دراصل ایک تقریر تھی جسے بعض دوستوں کے مشورے سے پمفلٹ کی صورت میں اشاعت کے لیے دیا گیا تھا۔ اب جب کہ اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا ہے، اسلامک پبلیکیشنز جیسا اعلیٰ اشاعتی ادارہ اسے اب چھاپ رہا ہے۔ اس پمفلٹ کے پیغام کی اہمیّت غالباً پہلے سے بڑھ گئی ہے۔ خدا کرے کہ یہ زیادہ سے زیادہ افراد میں "اپنی اصلاح آپ" کرنے کا ولولہ پیدا کر سکے۔

مؤلّف

لاہور، ۱۷ اکتوبر ۱۹۶۰ء

# اپنی اصلاح آپ

اسلام میں تعمیرِ سیرت اور اصلاحِ کردار کی اصل ذمّہ داری ہر شخص کے اپنے اوپر عائد ہوتی ہے۔ یہ بات کہتے ہوئے میں حیاتِ اجتماعیہ کی اہمیّت کو کم نہیں کرنا چاہتا۔ میرے نزدیک آدمی تکمیلِ ذات کے لیے صحیح نظامِ جماعت پاکیزہ معاشرے اور صالح ماحول کا حد درجہ محتاج ہے اور ناسازگار اجتماعی ماحول میں تنہا کسی فرد کا اپنی ذات کی اصلاح و تعمیر کی سعی کرنا ایک ایسا کٹھن امتحان ہے کہ جس کا تصوّر ہی دل کو لرزا دیتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ برحق ہے کہ عنداللہ ہر شخص اپنا ذمّہ دار آپ ہے۔ ہر شخص کو خود جواب دہی کرنی ہے۔ ہر شخص سے اس کی متاعِ قوّت و حیات اور اس کے خزانۂ سیرت و کردار کے بارے میں علیحدہ طور پر محاسبہ ہونا ہے کہ اس نے اس کی حفاظت میں کس درجہ کی چوکسی دکھائی۔ اس کے استعمال میں کہاں تک احتیاط اور حکمت سے کام لیا اور اس کی نشوونما کے لیے ممکن العمل تدابیر سے کہاں تک کام لیا۔ وہاں تو ہر شخص کو عدالتِ الٰہیہ میں اس وقت تک اپنے پیروں پر کھڑے رہنا ہوگا جب تک وہ یہ حساب نہ دے لے کہ اس نے اپنی عمر کن مقاصد و مشاغل میں کھپائی، اس نے جوانی کا خزانۂ قوت کس مہم میں صرف کیا، اس نے کس طریقے سے کچھ آمدنیاں حاصل

کیں، ان آمدنیوں کو کن راستوں سے خرچ کیا اور حقیقت کا جتنا کچھ شعور اور فرائض اور ذمّہ داریوں اور حلال و حرام کا جتنا کچھ علم اسے ہو سکا اس کے مطابق عمل کرنے میں کہاں تک سرگرمی دکھائی۔ اپنی ذمّہ داری کے اس بوجھ میں وہ کسی دوسرے کو شریک نہ کر سکے گا اور دوست اور عزیز اس کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہو کر اس گھڑی کے کرب میں کوئی حصّہ نہ لیں گے۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (کوئی بوجھ اُٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اُٹھائے گا)۔

اس بات کی گنجائش ہے اور ضرور ہے کہ ناسازگار ماحول کی وجہ سے ایک شخص کو عدالتِ آخرت کے محاسبے میں الاؤنس ملے اور جن غیر اختیاری مزاحمتوں اور جبری رکاوٹوں سے دوچار ہو کر وہ بے بس ہو جاتا رہا ہو ان کی اسے منہائی دی جائے، لیکن ناسازِ ماحول سے کشمکش کرنے کی ذمّہ داری سے وہ کسی حال میں بری نہیں ہو سکتا، آخر ایک پاکیزہ نظامِ جماعت، ایک صاف ستھرا معاشرہ اور ایک سازگار ماحول مہیّا کرنا بھی تو خود افراد ہی کی ذمّہ داری ہے اور اس مقصد کے لیے جدّ و جہد کا آغاز ایک فرد ہی کی دعوت سے ہوتا ہے۔ اب اگر فرد پر بنیادی اور ابتدائی ذمّہ داری نہ رکھی گئی ہو تو ایک ناسازگار ماحول ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مقدّر ہو کے رہ جائے گا اور وہ ناسازگار جبری ماحول افراد کے لیے ایک مستقل عذر بن جائے گا۔ یہ چکّر پھر کہیں سے ٹوٹ ہی نہیں سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ انبیا علیہم السّلام کی دعوتِ اصلاح کا اوّلین اور براہِ راست مخاطب فرد ہے۔ خدا کے دین کی پہلی پکار ہم میں سے ایک ایک کی روح و شخصیّت سے ہے، اس کا پہلا پیغام قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ کا پیغام ہے۔ اس

کے پورے نظامِ تربیت کا منشا یہ ہے کہ ہم اپنے لیے اپنے ہی اندر ایک مربّی و مزکّی فراہم کریں۔ خارجی تعاون کے بھی ہم محتاج ہیں اور حصولِ علم اور اصلاحِ عمل میں بیرونی امداد ہمارے لیے نہایت ضروری بھی ہے اور حد درجہ مفید بھی، مگر اپنی شخصیت کے اصل معمار ہم خود ہیں اور ہمیں اپنی اصلاح کے لیے سب سے بڑھ کر اپنی مدد کی ضرورت ہے۔

## خارج سے مدد

خارج میں انسانی شخصیت و کردار کی درستی کے لیے جو عوامل کام کرتے ہیں ان میں سے ایک قانون کی طاقت ہے، مگر قانون کی طاقت صرف ان اجتماعی اعمال پر گرفت کر سکتی ہے جو واضح طور پر دوسروں کے لیے ضرر رساں ہوں اور جن کے لیے کافی شہادت بہم پہنچ جائے اور شہادت کی مدد سے واقعات کی صحیح صحیح تصویر و تعبیر سامنے آجائے۔ قانون کی طاقت اپنے فیصلوں میں غلطی کر سکتی ہے، شہادت ناکافی ہونے پر بے بس ہو سکتی ہے۔ نجی اعمال کے دائرے میں بے تعلّق بھی رہتی ہے، وہ محض بُرائی کے انسداد کی منفی تدابیر تو کر سکتی ہے، مثبت طور پر تعمیرِ کردار کا فریضہ انجام نہیں دے سکتی اور پھر اعمال کے پیچھے رزمِ خیر و شر کا جو ہنگامہ بپا ہے اس تک دسترس نہیں رکھتی۔

دوسری طاقت رائے عام کی طاقت ہے جو ہمیں بُرائی سے روکنے اور بھلائی کی طرف بڑھنے میں مدد دے سکتی ہے۔ معاشرے کی اچھی مستحکم روایات، نظامِ تعلیم کی طرف سے ذہن کی آبیاری، خاندان اور حلقۂ ربط و تعارف میں قائم شدہ اقدار اور کسی اصولی جماعت کا نظامِ تربیت و احتساب،

یہ سارے عوامل ہمیں بڑی مدد دیتے ہیں۔ لیکن یہ عوامل بھی ہماری رفتار و گفتار تک رسائی رکھتے ہیں اور ہمارے اس عالمِ بطن میں نہیں اُتر سکتے جس کے اندر ہمارے سارے نظامِ کردار کی تشکیل ہوتی ہے۔ خیال کی ندی کا وہ پہلا جھرنا جو ہمارے مرکزِ اندر سے پھوٹتا ہے اور جس سے عمل و کردار کی ساری لہریں اُٹھتی ہیں، اس پر رائے عام کو بھی تصرّف حاصل نہیں ہے۔

معاشرہ کی طرف سے ہماری اخلاقی تعمیر کے لیے ایک وسیع نظامِ تعلیم و تربیّت بھی کام کرتا ہے جس کا مرحلۂ اوّل خاندان ہے، پھر معابد ہیں، درسگاہیں ہیں، پھر صحافت و ادب اور ریڈیو اور سینما کے ذرائع و وسائل ہیں۔ پھر بے شمار علمی و تحقیقی اور سماجی و ثقافتی ادارے ہیں۔ یہ وسیع نظامِ تعلیم و تربیّت ہمارے ذہن و کردار کی تشکیل میں بہت بڑا حصّہ لیتا ہے مگر اوّل تو خود اس وسیع نظامِ تربیّت میں جب بگاڑ آجاتا ہے اور اس میں بھلائی کے ساتھ ساتھ بُرائی گھُل مِل جاتی ہے تو یہ اُلٹا فرد کے کردار کی تخریب کرنے لگتا ہے اور اس کے بُرے اثرات سے اپنا بچاؤ کرنے کے لیے فرد میں ایک شعوری ارادہ موجود ہونا چاہیے۔ دوسرے یہ نظامِ تربیّت اچھا ہو کر بھی فقط کچھ معلومات اور روایات اور جذبات اور اقدار ہمیں بہم پہنچا سکتا ہے۔ لیکن ایک سرگرم عمل انسان بننے اور ایک معلوم شدہ نقشے پر ڈھلنے کے لیے اپنے ہی ارادے کی ضرورت ہوتی ہے۔

باہر سے ایک مدد ہمیں نفسیاتی تجزیہ کاری کے فن سے ملتی ہے۔ نفسیاتی تجزیہ کاری ہماری ذہنی سرزمین کی کھُدائی کر کے بگاڑ کے کسی خاص بیج اور فتنہ

کی کسی ایک جڑ کی نشان دہی تو کر سکتی ہے، مگر وہ اصلاح کے لیے ہمیں مضبوط ایمانی جذبے اور انقلابی درجے کی قوتِ ارادی سے مالا مال نہیں کر سکتی۔

یہ سارے عوامل و ذرائع اپنی جگہ بہت مفید اور ضروری ہیں۔ لیکن یہ ہماری اپنی ابتدائی ذمہ داری کو کم نہیں کر سکتے۔ انسان کی خودی جب تک خود ہی بیدار ہو کر شخصیت و کردار کی تعمیر اور بُرائی کے حملوں سے اُسے بچانے کا عزم نہ باندھ لے، کوئی قانون، کوئی وعظ، کوئی درس، کوئی نفسیاتی تجزیہ، کوئی نظامِ تزکیہ اور کوئی تربیت گاہ آدمی کو صحیح نہیں بنا سکتی۔ اپنا شعور اگر سو یا رہے اور اپنی قوتِ ارادی اگر سُن ہو رہی ہو تو خارج کی ساری تدابیر آہستہ آہستہ بے جان اور غیر مؤثر ہو جاتی ہیں۔ آدمی کے اندر کا مزکّی و مربّی اگر مر گیا ہو تو باہر کے مزکیوں اور مربّیوں کی تلقینات محض موجبِ سمع خراشی ہوتی ہیں جن کو سُن کر تفکّر و تدبّر پیدا ہونے کے بجائے اُلٹا اُونگھ طاری ہونے لگتی ہے اور باہر سے عائد کردہ بہترین اعمال بھی بے جان معمولات و عادات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

## اصلاحِ نفس کا نقطۂ آغاز

پس اسلام کو جس طرح اور جس حد تک میں نے سمجھا ہے، اس کی رُو سے اصلاح کا نقطۂ آغاز آدمی کا یہ احساس ذمہ داری ہے کہ اپنے بھلے اور بُرے یا اپنی اصلاح اور اپنے بگاڑ کا ذمہ دار میں خود ہوں۔ جس دن یہ احساس انگڑائی لیتا ہے اس دن انقلابِ سیرت کا آغاز ہو جاتا ہے اور جب تک یہ احساس سُن ہوا رہتا ہے، ایمان و اخلاق کے لحاظ سے آدمی پستی کے گڑھے

میں پڑا کروٹیں لیتا رہتا ہے اور بیشتر یہ ہوتا ہے کہ ساری عُمر اسی حالت میں برباد ہو جاتی ہے۔ آخری لمحے آدمی کی رُوحِ پشیمان فریاد کرتی ہے کہ لَوْلَا اَخَّرْتَنِیْ اِلٰی اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَکُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ (اے خدا! کیوں نہ تُو نے مجھے مزید عرصہ کی مُہلت دی کہ مَیں صدقہ کرتا اور نیک لوگوں میں شامل ہو جاتا)۔

شیطانی قوّتیں اس ذمّہ داری کو سُلا رکھنے کے لیے بڑے جتن کرتی ہیں۔ وہ نفس کو کئی کئی اقسام کے منشّی مشروب پلاتی ہیں اور افیون گھول گھول کر بڑے خوشنما فنجانوں میں پیش کرتی ہیں۔ جب تک یہ احساسِ افیون زندہ رہتا ہے، آدمی اپنی کمزوریوں، اپنی غلطیوں اور اپنے ناکارہ پن کی ذمّہ داری دوسروں پر ڈالتا رہتا ہے۔ سارے قصور اسے دوستوں، ساتھیوں، گھر کے لوگوں، جماعتی رفقا، معاشرتی ماحول اور سیاسی نظام ہی میں نظر آتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ان خطوط پر سوچتا ہے کہ اگر فلاں ایسا نہ کرتا تو میں پستی میں نہ گرتا، اگر یُوں نہ ہوا ہوتا تو میں وہ اور وہ اچھائی پا لیتا، اگر حالات ایسے اور ایسے نہ ہوتے تو مجھے موجودہ روش اختیار نہ کرنی پڑتی۔ اسی ذہن کے ساتھ دنیا کا ہر مجرم سوچتا ہے۔ اور وہ قتل اور چوری اور جیب تراشی اور زنا کے جرائم کا ارتکاب کرنے کے بعد ان کی ذمّہ داری خارج میں کسی دوسرے کے سر ڈالتا ہے۔

احساسِ ذمّہ داری کے سُن ہونے کی صورت میں دوسری سمت آدمی اپنی اصلاح و تعمیر کا مطالبہ تمام تر دوسروں سے کرتا ہے۔ وہ بظاہر اس بات

کا حریص بنتا ہے کہ مجھے نیک ہونا چاہیے اور میری سیرت کو بڑے اعلیٰ معیار پر پہنچنا چاہیے، مگر ساتھ ہی وہ چاہتا یہ ہے کہ دوسرے لوگ معمار بن کر اس کی شخصیت کی عمارت کو اُٹھائیں۔ دوسرے ہی اینٹیں ڈھوئیں، دوسرے ہی گارا بنائیں، دوسرے ہی ردّے رکھیں اور وہ کھڑا دیکھتا رہے کہ اس کی زندگی کا حسین و جمیل قصر تیار ہو رہا ہے۔ دوسرے اس سے اخلاقی تقاضے منوائیں، دوسرے اس کے اندر شعور اتاریں۔ دوسرے ہی اس کی قوّتِ ارادی کو پاؤں پر کھڑا کر دیں اور دوسرے ہی اسے اچھے اعمال پر مجبور کر دیں۔ کوئی حلقۂ درس اس کے اندر قرآن کی محبّت بھر دے، کوئی تربیت گاہ اس کی نمازیں روحِ خشیت ڈال دے، کوئی اجتماع اس کے جذبۂ ایثار کو رُوبہ عمل لے آئے، کوئی اسے اونچی فضاؤں میں اُڑا لے جائے۔

پھر جب کہ اس کے مطالبے پُورے نہیں ہوتے تو وہ سوچتا ہے کہ کہیں کوئی خرابی ہے، درس و تلقین میں کوئی خرابی ہے، کسی نظامِ تربیت میں کوئی کوتاہی ہے، کسی تنظیم میں کوئی قصور ہے، کسی طریقِ کار میں کوئی خلل ہے۔ نظامِ مساجد میں فتور ہے، طبقہ علماء میں بگاڑ ہے، سرے سے نظریۂ دین میں کمزوری ہے یا اسلام وقت سے پیچھے رہ گیا ہے، وہ، اور ہر جگہ خرابی تلاش کرتا ہے اور پا لیتا ہے مگر اُسے اپنے اندر کی خرابی کا پتہ نہیں چلتا، اُسے معلوم نہیں کہ اس کے اندر کا انسان دنیا و مافیہا سے غافل پڑا سو رہا ہے۔ وہ پریشان ہو ہو کر اپنی کوتاہیوں کا الزام دوسروں پر ڈالتا ہے، وہ بڑی مہارت سے تنقید کرتا ہے اور اس کی تنقید بڑی دلچسپ شان کی ہوتی ہے کہ جو کوتاہی

خود اس کے اندر سب سے بڑھ کر پائی جاتی ہے اسی کی نشان دہی وہ دوسروں میں بڑے زور شور سے کرتا ہے۔ وہ اگر اخلاقی ارتقاء میں خود سُست رو ہوگا تو وہ دوسروں کی سستی ارتقاء پر گرفت کرے گا۔ وہ اگر خود تشدّد پسند ہوگا تو وہ دوسروں پر تشدّد کا الزام تھوپے گا، وہ اگر خود لین دین کے معاملات میں عدمِ انضباط کا شکار ہوگا تو وہ دوسروں کی ہر بھول چوک پر خیانت کا لیبل لگائے گا، اس کا اپنا معیارِ زندگی اگر مسرفانہ ہوگا تو وہ دوسروں کی معتدل روش کو بھی مبالغہ آمیز طریق سے تبذیر کے زیرِ عنوان رگھے گا۔ وہ خود اگر بعض دینی تقاضوں کو پورا کرنے میں ڈھیلا پڑ گیا تو عین انہی تقاضوں کے بارے میں دوسرے بہتر لوگوں کو ناکارہ ثابت کرنے گا، وہ اگر خود مصالح کے نام پر بڑے بڑے اصولوں میں لچک پیدا کر لیتا ہو تو وہ دوسروں کو بے اصول ثابت کرنے پر پورا زورِ نطق صرف کر دے گا۔ وہ جب خود ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے گا تو ساری دنیا کے تعطّل کا ماتم کرے گا۔ وہ جب خود والہیت کا عالم گنوا چکے گا تو دوسروں کے اندر کی روحِ اخلاص کی بربادی کا نوحہ کرے گا اور وہ خود جس مرحلے پر آکر اعلیٰ نصب العین کے لیے ادنیٰ ذاتی قربانی دے کر دوسرے سے فراخ دلانہ تعاون کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھے گا تو دوسروں کی تنگ دلی اور بے لحاظی کا دُکھڑا سنائے گا۔

انسان کا آخری حربہ یہ ہے کہ اپنی نالائقیوں کی ذمّہ داری سے بری ہونے کے لیے جبریہ کے فلسفہ کی آڑ لیتا ہے۔ ہر دور میں ایسے لوگ بکثرت پائے گئے ہیں جنہوں نے اپنی پستیوں کا ماتم کرنے کے بجائے تقدیر کا ماتم کیا ہے۔

خصوصاً جب بھی کسی بندۂ حق نے دعوتِ اصلاح دی تو جمود پسند عنصر نے اپنے بگاڑ کی ذمہ داری خدا کی مشیت پر ڈالنے کی کوشش کی۔ اور اپنی بے عملی اور بدعملی میں مگن رہنے کے لیے یہ نظریہ پیش کیا کہ اگر خدا کو پسند ہو کہ ہم ایمان لائیں یا اچھے عمل کریں تو وہ جبر و قوت سے ہمیں سیدھی راہ پر ڈال سکتا ہے۔ لیکن جب اس نے ایسا نہیں کیا تو ہم بندگانِ مجبور کیا کر سکتے ہیں۔ حافظ شیراز نے اس ذہنیت کا عکس شعر کے آئینے میں یوں پیش کیا ہے ؎

در کوئے نیک نامی مارا گزر نہ دادند
گر تو نہ می پسندی تغییر کن قضا را

انسان اپنا کیس بڑی خوبی اور مہارت سے مرتب کرتا ہے۔ وہ ہزار جرائم کا ذمہ دار ہونے کے باوجود ایک مظلوم مدعی بن کے انسانیت کی عدالت میں آتا ہے اور نہ جانے کس کس کو مدعا علیہ بنا کر مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیتا ہے وہ خود ہر حال میں مجبور اور بے بس ہوتا ہے اور دوسرے لوگ ہر حال میں اس کی لغزشوں اور دہشتوں اور نامعقول حرکتوں کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اس کے پاس اپنے لیے بڑے الاؤنس ہیں۔ بڑی رعائتیں ہیں، بڑی چھوٹ ہے، بڑی عفو کاریاں ہیں، مگر دوسروں کے لیے اس کے جذبات کا حملہ بھی سنگین ہوتا ہے، اس کی زبان بھی بڑی درشت ہوتی ہے۔ اس کا استدلال بھی بڑا زوردار ہوتا ہے۔ اور اس کی کسوٹیاں اور معیارات بھی کڑے ہوتے ہیں۔ انسان عالم فریبی ہی کا نہیں، خود فریبی کا بھی استاد واقع ہوا ہے۔ مگر یہ ساری عالم فریبیاں اور خود فریبیاں اسی دنیا تک ہیں۔ آخر کار ایسے اس مقام پر پہنچنا ہے جہاں کوئی فریب نہ چلے گا اور سارے فریبوں کی قلعی کھل جائے گی

اور اسے اپنے نفس کا ذمّہ دار آپ ہوتے ہوتے جواب دہی کرنی ہوگی۔

یہ سارے احوال و کوائف اور یہ گوناگوں نفسیاتی تجربے جن سے آدمی گزر رہا ہوتا ہے، محض اس امر کی علامت ہیں کہ اس کے اندر اس کا جو مصلح ودیعت کیا گیا ہے وہ سو رہا ہے۔ اس کا احساسِ ذمّہ داری سُن پڑا ہے۔

اس باطنی مصلح طاقت کو پیدا کرنے کے لیے دعوتِ انبیاء گونجتی ہے، کہ، لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔ وہ کہتی ہے کہ ہر فردِ انسانی نے جو کچھ خیر اپنے لیے سمیٹا وہی کچھ اس کے پلّے پڑنے والا ہے اور جو کچھ شر اس نے فراہم کیا اسی کا وبال اس کو بھگتنا ہے۔ دوسروں کی بھلائی اس کی بُرائی کا ازالہ نہیں کر سکتی اور دوسروں کی بُرائیاں اس کی بھلائی کو ملیامیٹ نہیں کر سکتیں۔ یہاں کا قانون یہ ہے کہ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ ہر ایک کا اپنا اپنا کھاتہ الگ الگ کھُل رہا ہے۔ آخرت کے بنک میں جو کچھ کسی کا جمع ہے اُسے کوئی دوسرا جعلی چیک پر برآمد نہیں کر سکتا اور جس کا کھاتہ خالی ہے وہ کسی دوسرے کے کھاتے سے کوئی حساب منتقل نہیں کرا سکتا۔ آدمی کی سیرت کی تجوری میں وہی مال داخل ہوتا ہے جو خود اس نے اپنی محنت سے کمایا ہو، دوسروں کی کمائی اس کے سرمائے میں اضافہ نہیں کر سکتی اور نہ دوسروں کے بہی کھاتوں پر تنقید کر کے وہ کوئی حصّہ اخذ کر سکتا ہے۔ یہی حق ہے جسے قرآن نے یُوں بھی بیان کیا کہ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ جو کچھ بوؤ گے وہی کاٹو گے۔

ذمّہ داری کی حسّ جس دن چونک اُٹھتی ہے تو آدمی اس دن زندگی کی کھیتی کو زرخیز بنانے کے لیے ایک کسان کی طرح پھاوڑا کندھے پر ڈالی نکل کھڑا ہوتا ہے۔

وہ اپنی شخصیت کے چٹیل میدان میں ہل چلاتا ہے، وہ مستحکم شدہ غلط عادات کے ٹیلے توڑتا ہے، وہ باطل تصوّرات کی جھاڑیاں اکھیڑتا ہے۔ وہ الہامی تعلیم کا پانی دیتا ہے، وہ حُسنِ نیّت کا بیج بوتا ہے۔ یہاں تک کہ کردار کی ایک فصل لہلہانے لگتی ہے اور آہستہ آہستہ اس پر سعادت و کرامت کے برگ و بار آتے ہیں۔ پھر جب فصل تیار ہو کر آخرت کے کھلیان میں پہنچتی ہے اور اس کی گہائی ہو جاتی ہے تو وہ حیاتِ دوام کے لیے کھتے بھر لیتا ہے۔

انبیاء کی سعیٔ اصلاح کا اصل ہدف مقصود اسی احساسِ ذمّہ داری کو چونکانا اور جھنجھوڑنا اور بروئے کار لانا ہے۔ یہ جاگ جائے تو پھر قسمت جاگ اُٹھتی ہے۔ یہ سوئی رہی تو سر سے تقدیرِ انسانی سوئی رہتی ہے۔ اس حسّ کو جگانے کے لیے کائنات میں بے شمار دلائل و مظاہر کام کرتے ہیں، اس کو جگانے کے لیے طبعی واقعات اور نفسیاتی حوادث بڑی خدمت سرانجام دیتے ہیں، اس مسافرِ ازل کو فرض کے راستے پر گامزن کرنے کے لیے الہام کا جرس بجتا ہے۔

مجھے یہ ڈر ہے، دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

پس جس شخص کے اندر یہ حسّ کام کرنے لگے کہ میں اپنے بھلے اور بُرے کا خود ذمّہ دار ہوں اور خود مجھے اپنے دل کو زندہ رکھنا ہے، خود مجھے اپنے دماغ کو اچھے خیالات کا گہوارہ بنانا ہے، خود مجھے اپنی رُوح کو بالیدگی دینی ہے، خود مجھے اپنے کردار کو سنوارنا اور اپنی زندگی کو شیطانی حملوں سے بچانا ہے۔ اسی کے لیے خدا کی توفیق، مدد اور نصرت حاصل ہوتی ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ جَاهَدُوْا

فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا جو لوگ خدا کی درگاہ کی طرف بڑھنے کا عزم باندھ کر چل کھڑے ہوتے ہیں، انہی کو خدا کی طرف سے رہبری بھی فراہم کی جاتی ہے یہ احساسِ ذمہ داری جب زندہ ہوگا تو سیرت میں مسلسل ارتقاء ہونے لگے گا اور جب اس پر اُونگھ طاری ہوگئی، ترقی رک جائے گی۔ سو ہمیں ہر آن یہ دیکھنا چاہیے کہ سینے میں دل زندہ ہے یا نہیں اور دل زندہ کب بیدار اور چوکس ہے اور کب وہ اونگھنے لگا۔ دل جب زندہ اور بیدار رہتا ہے تو آدمی یوں سوچتا ہے کہ میرا فرض کیا ہے اور میں نے کیا کوتاہی کی، لیکن جب یہ مرجاتا ہے یا سوجاتا ہے تو آدمی ساری توجہ اس پر صرف کرتا ہے کہ دوسروں کی ذمہ داریاں کیا ہیں اور ان سے کیا کوتاہیاں سرزد ہوتی ہیں۔

## اپنے مرتبہ و مقام کا صحیح شعور

میرا ایک حاصلِ مطالعہ یہ ہے کہ انسانی کردار کی اساس اپنے مرتبہ و مقام کے صحیح شعور پر ہے۔ آدمی اپنے لیے اگر غلط مرتبہ و مقام تجویز کرلے تو اس کی زندگی خیال کی ننھی سی کونپل سے لے کر اعمال کے اہم ترین برگ و بار اور نجی سرگرمیوں سے لے کر بین الاقوامی مشاغل تک ساری کی ساری بگڑ جاتی ہے۔ وہ اصلاح یافتہ اسی صورت میں ہوتا ہے جب کہ وہ اپنے آپ کو صحیح مرتبہ و مقام پر رکھتا ہے۔ کائنات کی محفلِ وجود میں جب تک وہ اپنی مقررہ نشست کو تلاش نہیں کرلیتا وہ آوارہ و پریشان رہتا ہے۔ یہ نشست پالیتا ہے تو ٹھہراؤ اور توازن حاصل کرلیتا ہے۔

اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے انسان کو شعوری طور پر اس

کے صحیح مرتبہ و مقام سے آگاہ کیا ہے۔ اسلام کے دیے ہوئے علم حقیقت کی رُو سے آدمی خدا، اپنے ابنائے نوع اور کائنات کی مثلث میں صحیح جگہ اس شعور کے ساتھ پاتا ہے کہ:۔

——— خدا کے سامنے اس کا مقام عبدیّت کا مقام ہے۔

——— اپنے ابنائے نوع کے ساتھ اس کا رشتہ اخوّت و مساوات کا رشتہ ہے۔

——— اور مادی کائنات پر وہ خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے حکمران و متصرّف ہے۔

——— خدا کے سامنے اپنے مقامِ عبدیّت کو پہچان لینے کے بعد کبر، غرورِ علم و قوّت اور ظلم و تشدّد کے رجحانات کے وہ دروازے بند ہو جاتے ہیں جو انسانیّت کو تباہی و ہلاکت کی طرف لے جاتے ہیں۔ عبدیّت کا اشتراک تمام انسانوں میں جس رابطۂ اخوّت کو استوار کرتا ہے۔ وہ نسلی، جغرافی اور طبقاتی اُونچ نیچ اور باہمی کشاکش کا سدِّ باب کرتا ہے۔ مادی کائنات، اس کے عناصر و قوّات، فطرت کے فراہم کردہ مسائلِ کار اور ضروریاتِ زندگی کے مقابلے میں انسان جب خلیفۃ اللہ کا منصب اختیار کرتا ہے تو تمدّن گریز رہبانیت کا سدِّ باب ہو جاتا ہے اور آدمی کی عزّتِ نفس بھی بے جا تذلّل سے محفوظ ہو جاتی ہے جس کی بنیاد پر سارا احساسِ ذمّہ داری کھڑا ہوتا ہے۔

اس مرتبہ و مقام سے انسان جب کبھی آگے بڑھ کر استکبار کے راستے سے خداوندی کے دائرے میں قدم رکھ دیتا ہے تو بھی اس کا کردار غارت ہو جاتا ہے اور اس سے اگر وہ نیچے گر کر اپنے جیسے انسانوں اور مادی مظاہر اور دولت اور مشین کی طاقت کو معبود بنا لیتا ہے تو بھی اس کی سیرت پستی کے حوالے ہو جاتی ہے۔

انسان کو اس کے اس صحیح مرتبہ و مقام کا علم تو باہر سے دیا جا سکتا ہے مگر اسے صحیح مرتبہ و مقام پر کھڑا کرنا اور پھر مدت العمر اس پر قائم رکھنا کسی خارجی وسیلے کا مرہونِ منت نہیں ہو سکتا۔ اس مرتبہ و مقام پر کھڑے ہو کر اپنی سیرت کی ترازو "بودی" سے پکڑ کر تھامے رکھنا اور ہر ہر آن یہ اہتمام کرنا کہ نہ اس کا پلڑا استکبار کی جانب جھکے، نہ تذلّل کی جانب، بڑا امتحان ہے۔ دین کی ساری تعلیمات، اخلاق کے سارے ضابطے اور قانونِ شریعت کے سارے اوامر و نواہی اسی ترازو کی قسطاسِ مستقیم کو برقرار رکھنے کے لیے ہیں۔ مگر اسے تھامنے والا ہاتھ اور اس کی نگرانی کرنیوالی آنکھ کہیں باہر نہیں ہے بلکہ ہر آدمی کا اپنا ہی ہاتھ اور ہر آدمی کی اپنی ہی آنکھ اس کی ضامن ہے۔ اس وجہ سے زندگی کی اصلاح کی ذمہ داری ہمارے اپنے ہی اوپر عائد ہوتی ہے۔

## نصب العین

یہ واضح ہے کہ ہم اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے کچھ خواہشات و ضروریات کے زیر بار ہیں۔ ان خواہشات و ضروریات کو ہمیں چار و ناچار پورا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن انسان محض اپنی خواہشات و ضروریات پوری کرنے میں لگ جائے تو اس کے اندر اخلاقی زندگی سرے سے کروٹ ہی نہیں لیتی اور کوئی روحانی بالیدگی پیدا نہیں ہوتی۔ اخلاقی زندگی ایسی ذمہ داریوں سے عبارت ہوتی ہے جن کو پورا کرنے کے لیے اپنی خواہشات کی کچھ نہ کچھ قربانی دینی پڑے۔ دوسرے لفظوں میں اخلاقی زندگی ایثارِ نفس سے شروع ہوتی ہے۔ خواہشات میں تمام تر انہماک ہمیں حیوانی زندگی دے سکتا ہے، لیکن اعلیٰ درجہ کی انسانی زندگی خواہشات کو

کسی مقصدِ اعلیٰ پر قربان کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ گویا سیرت بنانے اور زندگی سنوارنے اور روحانی و اخلاقی ارتقا حاصل کرنے کے لیے انسان کے سامنے کوئی ایثار طلب نصب العین اور ذاتی مفاد سے بلند تر کوئی ہدفِ نگاہ ہونا چاہیے۔ بغیر اس کے نیکی، روحانیت، اخلاقی علو، تعمیرِ کردار اور اصلاحِ نفس کا کوئی امکان نہیں۔ نصب العین اور ہدفِ نگاہ جتنا کم تر اور محدود تر یا بلند تر اور وسیع تر ہوگا اسی کے مطابق انسانی سیرت و کردار میں بھی بلندی و پستی اور وسعت و محدودیت پائی جائے گی۔ وہ شخص جو جانور کی طرح فقط اپنے چارے پانی یا ٹھانوے اور جوڑے کی طلب میں سرگرم رہتا ہے اس کے اندر سیرت و کردار نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاسکتی۔ اس سے بڑھ کر وہ افراد ہیں جو خاندان، قبیلے، نسل، قومیت، وطن، طبقے یا کسی خاص تنظیم یا جتھے کا مفاد سامنے رکھ کر ایثارِ نفس کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے اندر ایک محدود نوعیت کا کردار تشکیل پاتا ہے۔ لیکن اسلام نے ہمارے سامنے ساری انسانیت کا مشترک اور وسیع ترین مفاد بطورِ مقصد سامنے رکھا ہے اور ہماری نگاہیں رضائے الٰہی پر مرتکز کی ہیں۔ اسلام کے اس عظیم نصب العین کو صحیح طور پر اپنا لینے سے عظیم درجے کا کردار تشکیل پاتا ہے۔ اس نصب العین سے بڑھ کر کوئی دوسرا نصب العین ایثارِ نفس نہیں مانگتا۔ یہ قیمت میں سب سے بڑھ کر گراں بہا ہے۔

ہر نصب العین آدمی کے سامنے کچھ اصولوں اور تقاضوں کو فرض بنا کر رکھتا ہے۔ ہر فرض خواہشات کے مقابلے پر آکر قربانی مانگتا ہے۔ فرائض اور خواہشات کے درمیان کشمکش ہوتی ہے اور یہ کشمکش زندگی کو ایک امتحان بنا دیتی ہے۔ ع

عرصۂ عالم میں تیرا امتحاں ہے زندگی

اس کشمکش اور حالتِ امتحان میں پڑ کر آدمی کو ہر آن فیصلے کرنے پڑتے ہیں اور ان فیصلوں کو نبھانا پڑتا ہے۔ امتحان میں پڑنا اور صحیح فیصلے کرنا اور پھر ان کو نبھانا جوہر کردار کو نشو و نما اور جِلا دیتا ہے۔ جیسے کہ سونا بار بار کٹھالی میں پڑ کر کُندن بنتا ہے۔

کوئی نہیں جو حالتِ امتحان کا احساس باہر سے آدمی پر ٹھونس سکے۔ کوئی نہیں جو کشمکش کی ذمہ داری خارج سے تسلیم کرا سکے، کوئی نہیں جو فرض و خواہش کے کسی معرکے میں آدمی کے باطن میں ہونے والے فیصلے کو سمجھ سکے اور اس کو زبردستی صحیح راستے پر ڈال سکے اور کوئی نہیں جو کسی اخلاقی فیصلے کو وفاداری سے نبھانے پر بیرونی دباؤ سے آدمی کو مجبور کر سکے۔

عمر بھر کے اس معرکۂ خیر و شر میں صرف وہی شخص بازی لے جا سکتا ہے جو ایک سپاہی کا سا جذبہ اپنے اندر رکھتا ہو، ایک سنتری کی طرح اپنے اصول و فرائض کا پاسبان بنے اور ایک پہلوان کی طرح سفلی میلانات سے کشتی لڑتا رہے۔ جس شخص کے اندر کا سپاہی ہتھیار پھینک چکا ہو، جس شخص کے اندر کا سنتری سو گیا ہو اور جس شخص کے اندر کا پہلوان بے حس و حرکت ہو گیا ہو وہ زندگی کا کھیل ہر چکا۔ کوئی دوسرا اس کے حصّے کی جنگ نہیں لڑ سکتا اور کوئی دوسرا اس کی جگہ پہرہ نہیں دے سکتا۔

کسی نصب العین کا قطعی طور پر انتخاب کر لینا، اس پر ہمیشہ اپنی نگاہ مرتکز رکھنا، اس کے عائد کردہ فرائض کو اپنے لیے واجب قرار دینا، اس کے تقاضوں کے تحت اپنی خواہشات کی قربانی دینا، اس کی پیدا کردہ کشمکش میں مجاہدانہ انداز سے اقدامات کرنا اور ہر قدم پر

مضبوطی سے جمے رہنا خود ہمارا کام ہے، دوسروں کا نہیں!

جو شخص اسلام کو زندگی کا رہنما بناتا ہے وہ گویا اپنے لیے بلند ترین نصب العین طے کر لیتا ہے۔ اور وہ ہے رضائے الٰہی کا حصول اور اس غرض کے لیے پوری انسانیت کی فلاح چاہنا اور اس فلاح کے لیے نظامِ حق کو کامل شکل میں قائم کرنا اور اسے نشوونما دینا! اس طرح وہ اپنے لیے بے شمار فرائض معین کر لیتا ہے، وہ اپنے اوپر حدود و قیود عائد کر لیتا ہے، وہ ایثارِ نفس کے مواقع سے آگاہ ہو جاتا ہے، وہ اپنے آپ کو ایک امتحان گاہِ کشمکش میں لا کھڑا کرتا ہے۔ اب وہ کیوں یہ چاہتا ہے کہ روز روز کوئی اسے بتائے کہ تو مسلم ہے، بار بار اسے نئے سرے سے سمجھائے کہ تیرا نصب العین اب رضائے الٰہی ہے۔ نت اس کے فرائض کی فہرست اس کے سامنے پڑھتا رہے کہ ان کو تجھے پورا کرنا ہے اور ان کے لیے قربانیاں دینی ہیں۔ تواصی بالحق تواصی بالصبر یقیناً ایک اسلامی معاشرہ یا نظامِ جماعت کی لازمی شان ہے اور ایک نصب العین کے فدائیوں کی رفاقتِ باہمی کا تقاضا بھی ہے کہ وہ بار بار تلقینِ حق کریں، تذکر کی فضا آراستہ رکھیں، لیکن اگر ہر شخص اپنی استقامت اور راست روی اور اصلاح کا دارومدار دوسروں پر رکھے اور اپنی ذمہ داری آپ پوری نہ کرے تو سرے سے تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا ماحول ہی نہ بن سکے گا۔

## ضابطہ و معیار کا علم

نیک بننے کے لیے نیکی کا مبہم تصور کافی نہیں۔ سیرت و کردار کو سنوارنے کے لیے ایک واضح ضابطہ و معیار کا علم ہونا ضروری ہے۔ ہر دور، ہر خطے اور ہر قسم کے حالات میں افراد اور اقوام کے اندر بہتر زندگی حاصل کرنے، برائیوں اور خرابیوں سے بچنے

اور تعمیر و ترقی کے راستے پر بڑھنے کی خواہش فطری طور پر موجود رہی ہے۔ لیکن بہتر زندگی حاصل کرنے کا راستہ بالعموم غیر واضح ہو رہا ہے۔ جب کبھی راستہ غیر واضح رہا ہے انسانی قافلے دھندلے قیاسات کے پیچھے پیچھے آوارہ گردی کرتے رہے ہیں۔ انسانیت صلاح و فلاح ایسے ہی کسی دور میں پا سکی ہے۔ جب کہ صلاح و فلاح کا واضح ضابطہ اس کے ہاتھ آیا ہے۔

انبیاء علیہم السّلام کا احسانِ عظیم یہی ہے کہ انہوں نے نیکی اور صلاح و فلاح کے ضابطے کو وضاحت کے ساتھ انسانیت کے سامنے رکھا۔ اپنی آخری اور مکمّل شکل میں یہ ضابطہ قرآن نے پیش کیا ہے۔

ضابطہ کے ساتھ انسان ہمیشہ اس امر کا محتاج بھی رہا ہے کہ اس ضابطے کے مطابق انسانی زندگی کا عملی نمونہ اس کے سامنے رہے۔ وہ ہدایت حاصل کرنے کے لیے کسی تجریدی فلسفے سے زیادہ کسی عملی مظاہرے سے استفادہ کرتا ہے۔ وہ محض منطقی دعوت و استدلال سے انقلابی روح اخذ نہیں کر سکتا بلکہ اسے ایسی حکمت درکار ہے جس کے ساتھ عملی تعبیر موجود ہو وہ ایسی منطق ہوتی ہے جو واقعات کے پیرائے میں جلوہ گر ہو۔ وہ ایسے استدلال کا ضرورت مند ہے جس کے اندر انسانی جذبات کی گھلاوٹ ہو۔ دوسرے لفظوں میں وہ مجرد ایک کتابی ضابطے سے پوری ہدایت نہیں پا سکتا بلکہ اسے کسی ایسی انسانی ہستی کی ضرورت ہے جو کتابی ضابطے کو انسانی زندگی میں کارفرما دکھائے۔ اسے ایک اسوہ و معیار کی ضرورت ہے یہ اسوہ و معیار رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی انور ہے۔

تجربہ گواہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے دوستوں، حلقہ ربط و تعاون

سوسائٹی کے ممتاز، شہرت یافتہ افراد اور تاریخی شخصیتوں میں کہیں نہ کہیں اپنے لیے اسوہ و معیار رکھتا ہے اور پھر اپنے اخلاقی اصول بنانے میں روزمرّہ زندگی کے اقدامات کرنے میں بات چیت اور رفتار و گفتار کے اسلوب میں، حتیٰ کہ لباس کے انتخاب اور وضع قطع بنانے میں غیر شعوری طور پر اپنے اسوہ و معیار کی پابندی کرتا ہے۔ کچھ خاص ادائیں، کچھ خاص حرکات، کچھ خاص الفاظ اور ان کے لیے خاص لب و لہجہ اور اسی طرح خوشی اور غم، غصّے اور رحم، نفرت اور محبّت کے کچھ انداز ہم خاص خاص شخصیتوں سے مستعار لیتے ہیں۔ اب جیسا جیسا اسوہ و معیار کسی نے سامنے رکھا ہوتا ہے اسی طرح کا کردار اس کے اندر پروان چڑھتا ہے۔ کسی کے سامنے ایک فلمی ایکٹر کا کردار ہوتا ہے۔ کسی کے سامنے ایک ناول کا ہیرو ہوتا ہے، کسی کے سامنے کوئی شاعر یا ادیب ہوتا ہے، کسی کے سامنے کرکٹ یا ہاکی کا کوئی کھلاڑی ہوتا ہے، کسی کے سامنے محکمے کا کوئی افسر، پارٹی کا کوئی لیڈر یا ملک کا کوئی وزیر ہوتا ہے۔ بسا اوقات ہمارے متعدّد معیارات مختلف اطراف میں بکھرے ہوئے ہوتے ہیں اور ہم مختلف پہلوؤں سے بہت سی شخصیتوں کی تقلید بیک وقت کر رہے ہوتے ہیں۔ اسلام نے یہ چاہا ہے کہ ہم اپنی پوری اخلاقی زندگی کے لیے سرورِ عالم کی ایک ہی بے داغ اور بے میل شخصیّت کو اسوہ و معیار بنائیں اور سارا اکتساب وہیں سے کریں۔ انسانی کردار کے لیے یہی سب سے اونچا مقام ہے جس پر نگاہ جما کر بلند ترین پرواز کی جا سکتی ہے۔ اس معیارِ سیرت و کردار کی بننے والی ہستی کی سنت کا مستند ریکارڈ اس کی پوری تصویر ہمارے سامنے لا رکھتا ہے اور ہماری تاریخ کا ایوان اس کی لازوال روشنی سے جگمگا رہا ہے۔

اسلام کے پیش کردہ ضابطہ و معیار کو ہم قرآن و حدیث سے معلوم کر سکتے ہیں۔ قرآن و حدیث کا علم ہی وہ "العلم" (THE KNOWLEGE) ہے جس کی طلب ہر مسلم مرد اور عورت کے لیے فرض ٹھیرائی گئی ہے۔ اس العلم کے حصول کے لیے مرتبۂ اوّلین یہ ہے کہ آدمی عربی زبان سیکھے اور براہِ راست استفادہ کرے۔ یہ نہیں تو تراجم و تفاسیر موجود ہیں ان سے مدد لے۔ حلقہ ہائے درس اور تقاریر سے فائدہ اٹھائے۔ لیکن اس علم کی طلب کس میں کتنی ہے کتنی نہیں، یہ بات خود اس کے اپنے اُوپر انحصار رکھتی ہے اور یہ امر بھی آخر کار لوٹ کر اسی کے اُوپر آتا ہے کہ وہ حاصل شدہ علم کے مطابق کہاں تک اپنے آپ کو سدھارتا ہے۔ اس علم کی پیاس اگر موجود نہ ہو تو چاہے اس کے فوارے ہر طرف کیوں نہ چھوٹ رہے ہوں، ایک آدمی جاہل پڑا رہے گا اور اگر اس کے اندر عملی لحاظ سے جمود پیدا ہو گیا ہے تو چاہے علم اس کے اندر خارج سے ٹھنس بھی کیوں نہ رہا ہو اس کے حق میں بالکل بے نتیجہ رہ جائے گا۔

یہ فرد فرد کا اپنا کام ہے کہ وہ اپنے اندر ضابطہ و معیار کے علم کی پیاس برقرار رکھے اور حاصل شدہ علم کے مطابق عمل و کردار کی اصلاح کی مہم جاری رکھے۔

## ایک عزم۔ ایک فیصلہ

اگر ہم انسانی نفسیات کا گہرا جائزہ لیں تو پتا ہے زندگی کا کوئی کُلی اور ہمہ گیر انقلاب ہو یا کوئی جزئی اصلاح، ہر تبدیلی ایک عزم اور ایک فیصلے کا نتیجہ ہوتی ہے، جب تک ایک مجاہدانہ عزم نہ باندھا جائے اور جب تک قوتِ ارادی اپنے پیروں پر کھڑی ہو کر ایک قطعی فیصلے کا اعلان نہ کر دے ہمارے

اندر کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ بہت سی چیزیں ہیں جن کی ہم تعریف کرتے ہیں۔ اور گفتگوؤں میں ان کو واجب العمل مانتے رہتے ہیں۔ لیکن عملاً ان کو اختیار نہیں کرتے۔ دوسری طرف بہت سی چیزوں کو ہم بُرا کہتے ہیں اور ان سے بچنے کو وجہِ فلاح قرار دیتے ہیں۔ لیکن ساری عمر وہ ہمیں چمٹی رہتی ہیں۔ یہ مجہول حالت محض اس وجہ سے ہم پر برسوں طاری رہتی ہے کہ ایک قطعی فیصلہ نہیں کر پاتے۔ بلکہ بیچ میں لٹکے رہتے ہیں۔ اصلاحِ نفس کی مہم شروع کرنے کے لیے درجۂ اوّل کی ضرورت ہے کہ آدمی علم و شعور کے مطابق ہر معاملے میں قطعی فیصلہ کرنے اور عزمِ صمیم باندھنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرے۔

اسلام ایسا انسان تیار کرنا چاہتا ہے جو خدا اور رسولؐ کا فرمان بردار بن کر دوسروں کی بھلائی چاہنے، دنیا میں متاعِ خیر کا اضافہ کرنے اور زندگی کو حسن سے آراستہ کرنے کی مہم میں منہمک ہو جائے۔ اب اس طرز کا انسان وہی بن سکتا ہے جو یکبارگی یہ قطعی فیصلہ کر لے کہ آج سے میں کسی کے ساتھ بُرائی کرنے کے لیے نہ دماغ سے سوچوں گا اور نہ اپنے اعضا سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہونے دوں گا، آج سے میں انسانیت کی متاعِ خیر میں اضافہ کروں گا اور اس متاع کے نقصان کا روادار نہ ہوں گا۔ آج سے میں زندگی اور تمدّن اور معاشرت کو حُسن دوں گا اور اس میں بدنمائی پیدا کرنے میں کوئی حصّہ نہیں لوں گا۔ سرکارِ دو عالمؐ کی دعوت پر جن ہستیوں نے لبیک کہی تھی۔ انہوں نے ایسے ہی قطعی فیصلے کیے تھے اور ایسے ہی عزائم باندھے تھے۔ دنیا نے لالچ اور خوف کے سارے وسائل لے کر ان کے خلاف یورش

کی مگر وہ اس دنیا سے اس شدّت سے ٹکرائے کہ اس کے نظام ہائے باطل کے پرخچے اُڑ گئے۔ کیا مثال ہو سکتی ہے اس شخص کی کہ جس نے کھجوریں کھاتے کھاتے ایسا ہی قطعی فیصلہ کیا اور آن کی آن میں جہاد کے مورچے پر قربان ہو گیا۔

ایک ہم ہیں کہ دن رات دوسروں کی طرف سے پیش آنے والے جن تجربوں میں ناگواری محسوس کرتے ہیں اور ان کی بُرائی کا احساس ہوتا رہتا ہے ان سے خود باز نہیں آسکتے۔ بسوں پر جو ہڑبونگ ہوتی ہے، سڑکوں اور گلیوں میں جو غلاظت پھینکی جاتی ہے، بول چال میں زبانوں کی گندگی اور جذبات کی جو تلخی سامنے آتی ہے، نظر بازی اور فقرہ بازی میں جس کمینگی کا مظاہرہ ہوتا ہے اس سے کسے کرب محسوس نہیں ہوتا۔ مگر ہم خود ہڑبونگ مچاتے ہیں، ہم خود غلاظت پھینکتے ہیں، اور اپنی نگاہوں اور زبانوں پر ہم خود قابو نہیں رکھ سکتے۔

پھر ہمارے ہاں یہ عجیب صورتِ حالات پائی جاتی ہے کہ اونچی تعلیمی ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد بھی ہمارے روشن خیال افراد تک ان ساری گھریلو، سماجی، مجلسی، رسمی، معاملاتی پستیوں میں گرے رہتے ہیں جو جہالت کے شایانِ شان ہیں۔ اچھی سے اچھی کتابیں نظر سے گزرتی ہیں اور صدہا تقریریں اور گفتگوئیں سماعت میں آتی ہیں مگر اخلاقی احوال میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آتی۔ یہ انتہائی جمود کی علامت ہے۔

کردار وہ لوگ بنا سکتے ہیں جو جب جس بُرائی کا احساس کریں کہ یہ موجبِ آزار ہے تو اسی آن اپنے ذہن میں عزم باندھیں کہ بس اس لمحے سے میں نے اسے چھوڑا۔ اس کی زرّیں مثال مدینہ کی ان جوہر دار ہستیوں نے پیش کی تھی، جنہوں

نے شراب کی حرمت کا حکم سنتے ہی ہونٹوں سے لگے ہوئے پیالے الگ کر دیے یا پھر ان خواتین نے مبارک اسوہ قائم کیا جنہوں نے حجاب کا حکم سنتے ہی کمر پٹے پھاڑ پھاڑ کر فوراً اوڑھنیاں بنالیں اور گھونگھٹ نکال لیے۔ جو شخص بُرائی کو بُرائی محسوس کر لینے کے بعد اس کو ساتھ ساتھ لیے لیے چلتا ہے اور جو شخص ایک اخلاقی تقاضے کا شعور حاصل ہو جانے پر بھی اپنے اوپر اسے طاری نہیں کرتا، بلکہ "یہ ہونا چاہیے"۔ اور "یہ نہ ہونا چاہیے"۔ "یہ" اچھا ہے"، "یہ" بُرا ہے"۔ کے رٹے ہوئے جملے شاعرانہ انداز سے دہراتا رہتا ہے اسے کوئی درس اور کوئی نظامِ تربیت اور کوئی خانقاہ اور کوئی جماعتی ماحول سنوار نہیں سکتا۔ وہ ذہنی جمود اور قلبی فالج کا مریض ہے۔ وہ ہمیشہ اس انتظار میں پڑا رہے گا کہ کوئی اُسے پھونک مار کر یا ایک نگاہِ حقیقت ڈال کر کچھ بنا دے۔ اور کوئی زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اخلاقی علو کے مرتبے پر پہنچا دے۔

نیکی کا مقام حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر معاملے میں واضح ارادہ باندھا جائے اور قطعی فیصلہ کیا جائے، فیصلوں کو اصول بنا لیا جائے۔ اصولوں کو پائدار روایات اور مستحکم عادات کی شکل میں ڈھال لیا جائے۔ ہر ارادے کو پُورا کرنے، ہر فیصلے کو نبھانے، ہر اصول کا حق ادا کرنے اور عادات و روایات کا پابند رہنے میں قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ قربانیاں ہی ان کو قیمتی اور محبوب بناتی ہیں۔

شخصیت، عادات و روایات ہی سے بنتی ہے۔ فرد کی عادات اور قوموں، خاندانوں اور جماعتوں کی روایات بڑی آہنی طاقت ہوتی ہیں جو

کسی خاص طرز کے کردار کی حفاظت کرتی ہیں۔ ایک طریقے پر بار بار عمل پیرا ہو کر ایک شخص اس میں اتنا مضبوط ہو جاتا ہے کہ اگر اسے اس کے خلاف کسی حرکت کی دعوت دی جائے تو وہ مجبورانہ انداز سے معذرت کرے گا کہ "ایسا تو میں ہرگز نہیں کر سکتا"۔ اسی طرح ایک خاص طرح کی اخلاقی روایات رکھنے والے خاندان یا معاشرے کے کسی فرد سے اگر ان روایات کے خلاف کسی اقدام کا مطالبہ کیا جائے تو وہ غیرت مندانہ انداز سے انکار کر دے گا کہ یہ "میرے امکان میں نہیں ہے"۔

ایک شخص کے سامنے ہر معاملے میں واضح اور طے شدہ اصول اور فیصلے ہونے چاہئیں کہ میں یہ اور یہ کروں گا اور یہ اور یہ نہیں کروں گا۔ اس کے اعمال کی اٹل حدیں ہونی چاہئیں۔ اس کے اندر نیکی کی مستقل عادات اور روایات قائم ہو جانی چاہئیں۔ اسی لیے اسلام نے کبھی کبھار کے متفرق نیک اعمال کے مقابلے میں اس قلیل عمل کو ترجیح دی ہے جس پر آدمی مداومت اختیار کرے۔ نیکی جو بھی اختیار کی جائے وہ آدمی کی سیرت کا ایک مستقل جزو بن جانی چاہیئے۔

اب یہ بالکل واضح بات ہے کہ باطن میں فیصلہ کن عزم باندھنا، عزم کو اصول بنا لینا اور اصولوں کو عادات و روایات میں ڈھال لینا آدمی کے اپنے ہی اوپر منحصر ہے۔ خارج کا کوئی مربّی و مزکّی یہ ذمہ داری سرانجام نہیں دے سکتا۔ اس کے لیے اندر کے مربّی و مزکّی ہی کو جگانا پڑتا ہے۔

## معرفتِ نفس

اپنی اصلاح و تعمیر، بغیر اپنے آپ کو جانے ممکن نہیں۔ اس کے لیے بڑی ضرورت اپنے نفس کو جاننا اور اس کی معرفت حاصل کرنا ہے۔ معرفتِ

نفس کے معنی یہ بھی ہیں کہ نفسِ انسانی کی فطرت کو جانا جائے اور حدیث کے مطابق اس کے لیے ملکوتی قوّت اور اس کے مقابلے میں کام کرنے والی شیطانی قوّت کے درمیان جو کش مکش رہتی ہے اس پر نظر رکھی جائے۔ اور اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ خاص طور پر ایک شخص اپنے نفس کے انفرادی و امتیازی احوال کو سمجھتا ہو۔

نفس کو اگر ہم ایک نراجی کیفیّت میں چھوڑ دیں کہ اس میں مختلف اچھی اور بُری قوّتیں ایک دنگل مچائے رکھیں اور جب جو رجحان بھی زور پکڑے، زندگی اُسی کے مطابق ڈھل جائے تو اس نراجی کیفیّت کے ساتھ کسی اصلاح کا امکان نہیں۔ سیرت کے بنانے کے لیے نفس کا ایک منظّم سلطنت کی صورت اختیار کرنا ضروری ہے، جس میں تمام داعیات و رجحانات ٹھیک ٹھیک اپنے مرتبہ و مقام پر رکھے گئے ہوں اور ہر ایک کے لیے اس کی حدود متعیّن ہوں۔

ہر اصلاح طلب آدمی کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ وہ اپنی خاص کمزوریوں کا شعور حاصل کرے۔ بار بار کے تجربات سے ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہماری سیرت کا کمزور پہلو کیا ہے۔ کسی کے اندر کبر کا رنگ پایا جاتا ہے۔ کسی میں غصّہ کی تلخی زیادہ ہوتی ہے، کسی میں خود رائی کا مرض ہوتا ہے کسی کے جبلّی میلانات میں عدم توازن پایا جاتا ہے، کسی میں اسراف یا بُخل کے آثار ہوتے ہیں، کسی پر یاسیت کے حملے زیادہ ہوتے ہیں، کسی میں علیحدگی پسندی پائی جاتی ہے، اور کسی میں کچھ اور کمزوریاں ہوتی ہیں۔ اپنے اندر کی ایسی کمزوریوں کو جان لینا اور ان کے خلاف ایک جدّوجہد جاری رکھنا سیرت

کو سنوارنے کے لیے انتہائی لازم ہے۔ ورنہ اگر ہم اپنی کمزوریوں کو ڈھیلا چھوڑ دیں تو آخر کار وہ پورے کردار پر چھا جائیں گی۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ نفس اور ذہن اور روح کے مرکز پر کڑی نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے جس کا شریعت میں اصطلاحی نام قلب ہے۔ قلب ہی وہ سرچشمۂ اوّلیں ہے جہاں سے خیال اور احساس اور جذبے اور ارادے کے جھرنے پھوٹتے ہیں۔ فساد جب اس سرچشمہ میں آتا ہے تو پھر سارے کردار میں پھیل جاتا ہے اور اصلاح بھی جب اس سرچشمہ کی ہوتی ہے تو ساری سیرت سنور جاتی ہے۔ قلب درست ہو تو یہی اصل مربّی و مزکّی ہے۔ یہی بہترین مفتی اور جج، یہی چاق و چوبند پاسبان اور سنتری ہے۔ یہ بگڑ جائے تو پھر باہر کی کوئی امداد ہمیں سنوار نہیں سکتی۔

رسولِ اکرم ؐ کی رہنمائی یہ ہے کہ بگاڑ جب آتا ہے تو اسی قلب یا مرکزِ روح میں ایک سیاہ نقطہ نمودار ہوتا ہے۔ آدمی کی نگاہ اگر اس مرکز پر نہ لگی ہو اور وہ اس سیاہ نقطے کو فوراً ادھو نہ ڈالے تو یہ نقطہ پھیلنے لگتا ہے، یہاں تک کہ اس کی سیاہی سارے قلب کو محیط ہو جاتی ہے۔ ابتدا میں ایک گندا خیال، ایک گھٹیا جذبہ اور ایک فاسد اقدام سیاہ نقطہ پیدا کرتا ہے۔ اس سیاہ نقطے کا اگر فوراً ازالہ نہ کر دیا جائے تو پھر یہ پھیلاؤ اختیار کر کے سارے نامۂ سیرت کو سیاہ بنا دیتا ہے۔ ایک بیدار دل مسلم اسے نمودار ہوتے ہی توبہ و ندامت کے آنسوؤں سے دھو دیتا ہے۔

اب یہ ظاہر بات ہے کہ اپنے نفس پر نگاہ رکھنا، اپنی کمزوریوں کو جاننا

اور ان کے خلاف معرکہ آرا رہنا اور اپنے مرکزِ روح کی پاسبانی کرنا ہر ہر فرد کے اپنے ہی اُوپر منحصر ہے۔ اس دائرے میں باہر سے کوئی دوسرا اس کے حصّے کا فرض انجام نہیں دے سکتا۔ ہم دوسروں کی مدد کے کتنے بھی محتاج کیوں نہ ہوں، جب تک "اپنی اصلاح آپ" کا اصول اختیار کر کے ہم اپنے حصّے کی ذمّہ داری پُوری نہ کریں، دوسروں کی مدد سے بھی ہمیں کوئی فائدہ نہیں حاصل ہو سکتا۔